محمد مظہر الدین صدیقی

تاثرات

اسلامی جمہوریہ پاکستان

۲۹ فروری اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء ہماری قومی زندگی کے یادگار دن ہیں۔ ہمارے دستور کی تدوین اور منظوری اور پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اعلان ایسے تاریخی واقعات ہیں جن کو مستقبل کا مورخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دستور کی تدوین اور منظوری سے قبل پاکستان جن حالات سے گزر رہا تھا وہ ہر محبِ وطن کے لئے نہایت المناک اور تردد انگیز تھے۔ ملک پر ایک بے یقینی طاری تھی۔ ہماری اسلامی اور جمہوری روایات خطرہ میں تھیں۔ ایک متعین طرزِ حکومت کی عدم موجودگی سے ہر قسم کی بے آئینیوں اور شخصی اولوالعزمیوں کا دروازہ کھلا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ دور بے اطمینانی ختم ہو گیا اور ہمارے دو بڑے قومی نصب العینوں اور مطالبات پر تاریخ نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ایک یہ کہ ہمارا طرزِ حکومت جمہوری ہو جس میں عوام اپنی مرضی اور آزادانہ انتخاب سے اپنے حکمران چنیں اور دوسرے یہ کہ ہمارا معاشرہ اور حکومت اسلام کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات سے منحرف نہ ہو۔ ایک معین دستورِ حکومت کی عدم موجودگی میں کیا خطرات پیدا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ کرنا ہو تو اسلام کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالیئے اور حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں خانہ جنگیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کا ذہنی اعادہ کیجئے۔ کہ کس طرح بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ اور پاکباز بزرگوں کی موجودگی میں باہمی کشت و خون کا دروازہ کھل گیا۔ اور اسلام کی جمہوری روایات پامال کر کے بنو امیہ نے شخصی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اسوقت سے لیکر آجتک مسلمان شخصی مطلق العنانی کے گرداب میں پھنسے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے کبھی مسلمان حکمرانوں کی حکومت کو اپنی حکومت نہ جانا اور نہ اُن کے اندر مملکت کے ساتھ وہ جذبہ وفاداری پیدا ہو سکا جو آج تمام اقوام جدیدہ کا طرۂ امتیاز ہے کیونکہ صرف ایک جمہوری حکومت میں ہی جو عوامی جذبات و مطالبات کی نمائندہ ہو، حکمران طبقہ اور جمہور کے مابین حقیقی اتحاد و معاونت کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ جس ملک کی حکمت عملی میں عوام کو دخل نہ ہو جس میں حکمران طبقہ اور جمہور کے مابین دولت و ثروت، معاشرتی امتیازات اور خاندانی وجاہت کی دیواریں حائل ہوں اسکے عوام کو ملک کے بناؤ بگاڑ اور اسکی قسمت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

آج صدیوں کی مطلق العنانی کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو ایک جمہوری نظام ملا ہے جو اُن کے جذبات و رجحانات کا آئینہ دار ہوگا۔ اس لحاظ سے پاکستان کے دستور کی منظوری اسلامی تاریخ کا ایک بہت اہم موڑ ہے۔ ہم اس تبدیلی پر جتنی خوشی کا اظہار کریں کم ہے اور جس قدر شکر الٰہی بجا لائیں تھوڑا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم سے پہلے ترکوں نے بھی ایک جمہوری دستور اختیار

کیا تھا اگر ہمارے دستور کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلامی بنیادوں پر قائم ہے اور اس میں معاشرتی عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے ان اصولوں کو بروئے کار لانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ جن کے لئے پوری قوم بے تاب تھی۔ خدا اس دستور اور اس ملک کو جس کا یہ دستور ہے تا ابد قائم رکھے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم نے جن اسلامی مقاصد اور اصولوں کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے ان پر عملاً کاربند ہوں۔ یہ فریضہ نہ صرف ہمارے حکمرانوں پر عاید ہوتا ہے بلکہ عوام تعلیم یافتہ طبقات اور سیاسی لیڈروں پر بھی۔

یوں تو ہمارے دستور کی تدوین و تشکیل میں متعدد قوتوں اور اشخاص کی جد و جہد شریک تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب چودھری محمد علی صاحب نے اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جو حصہ لیا ہے اس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ قائد اعظم کے بعد جناب محمد علی صاحب ہماری قوم کے سب سے بڑے محسن ثابت ہوئے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمیں تادیر ان کی خدمات سے مستفید ہونے کا موقعہ عطا فرمائے۔

اب جبکہ دستور نافذ ہو چکا ہے ہمارے اوپر تین بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اولاً یہ کہ ہم غیر مسلموں اور اقلیتوں پر اپنے برتاؤ اور سلوک سے یہ واضح کر دیں کہ جس اسلام کے نام سے ان کے دلوں میں بے جا اندیشے پیدا کئے جا رہے ہیں وہ ان کے حقوق آزادی اور ترقی کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ اگر ہم غیر مسلموں کے ان اندیشوں کو دور نہ کر سکے۔ ملازمتوں اور نمائندہ اداروں میں ہم نے ان کا واجبی حق نہ دیا۔ نیز ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں ہم نے کوتاہی کی تو ہم اسلام اور پاکستان دونوں پر دھبہ لگا دیں گے۔

دوسرا اہم امر یہ ہے کہ ہم عدل معاشری کے ان اصولوں کو جلد از جلد بروئے کار لائیں جن کا ذکر دستور میں کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں دولت اور وسائل حیات کی تقسیم اتنی غیر منصفانہ ہے کہ جب تک ہم اپنے پورے معاشی نظام کی قلب ماہیت نہ کر دیں اسوقت ہمارا یہ دعوے شرمندۂ معنی نہ ہوگا کہ ہم اس ملک میں اسلامی نظام برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ کاشتکاروں کا ہے جو ہمارے ملک کا سب سے اہم عنصر ہیں۔ جب تک موجودہ جاگیریں اور زمینداریاں برقرار ہیں اس وقت تک کاشتکاروں کی حالت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ یہ معاملہ محض جزوی اصلاحات سے طے ہونے والا نہیں۔ اس کے لئے ایک بڑی بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

تیسرا معاملہ اس کمیشن سے متعلق ہے جو قوانین کی دیکھ بھال اور ترمیم کی غرض سے دستور کے تحت مقرر کیا جائے گا۔ ہمارے خیال میں اسلامی جمہوریہ کے اعلان کے بعد پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ اس کمیشن کا تقرر کیا جائے تاکہ وہ ہمارے قانونی نظام کا جائزہ لے کر ایسی سفارشات کرے جن سے اس ملک کے قانونی نظام کو اسلامی اصولوں پر ڈھالا جا سکے۔ لیکن اس کمیشن کے انتخاب میں بیحد احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ اگر اس کے لئے قدامت پسند اور جامد اشخاص کا انتخاب کیا گیا تو اس کا کام کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اور لادینی طبقات کو یہ کہنے کا موقع ہاتھ آئے گا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق قانونی نظام کی تشکیل ایک ناقابل عمل

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اسلام کا تصوّرِ مملکت

بہت سے فلسفیانہ اور مذہبی مثالیت پسندوں نے ایک مثالی مملکت کی تشکیل پر بحث کی ہے، اور کہیں کہیں بعض عملی تخیل پرستوں نے کم و بیش کامیابی کے ساتھ، اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ خیالی دنیا کی سیر ہمیشہ ایک خوشگوار ذہنی ورزش رہی ہے۔ افلاطون سے لے کر ایچ۔ جی ویلز تک ہم ایسے مثالی خاکوں کے تسلسل سے گذرتے ہیں جن میں فرد اور جماعت کے لئے حق و انصاف کے اصول اور زیادہ سے زیادہ ہمہ جہتی تہذیبی ترقی کے لئے فرصت اور مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ ان کوششوں میں سب سے زیادہ اہم یونان کی شہری مملکت تھی جس کا مکمل خاکہ سقراط اور افلاطون کا ترتیب دادہ تھا۔ لیکن خود انہیں بھی شک تھا کہ آیا یہ قابلِ عمل بھی ہوگا یا نہیں جیسا کہ آخر میں سقراط نے اقرار کیا، اس مملکت کا نمونہ تو صرف آسمانوں میں ہی رہا اور تمام تصورات اور نصب العینوں کی مانند عملی دنیا میں صرف ناقص طور پر ہی اس کی نقل کی جاسکی ہے۔ اگرچہ کہ افلاطون نے اس خصوص میں بحث کی ہے کہ یہ ممکنات سے ہے اور محض وہم و گمان نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی "جمہوریت" میں کہا ہے کہ "ہم ناممکن چیزوں کے متعلق گفتگو نہیں کرتے، تاہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ چیزیں دشوار ہیں۔ یہ محض خواب و خیال نہیں ہے، اگر سلطان فلسفی ہوتے یا فلسفی سلطان ہوتے تو یہ واقعیت کا رنگ اختیار کر لیتے"۔ مگر ممکن العمل ہونے کا یہ خیال افلاطون کے رنگِ طبیعت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، کیونکہ وہ دوسری جگہ یہی یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ "ہمارے شہر کی بنیاد الفاظ پر ہے، کیونکہ میرا خیال ہے زمین پر اس کا کوئی وجود نہیں"۔ یہ دوبارہ کہتا ہے، "اس کی کچھ پروا نہیں کہ آیا اس کا وجود ہے یا کبھی اس کا وجود بھی ہوگا"۔

جب افلاطون سلطان فلاسفہ یا فلسفی سلاطین کو دیکھنے کی خواہش کرتا ہے تو اگر اس کے ان دو لفظوں کے مفہوم کو، جیسا کہ اس نے اپنے مکالمات میں پیش کیا ہے، پوری طرح ذہن نشین کیا جائے تو اس کے سمجھنے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔ مختلف تہذیبوں نے اپنے مثالی انسان کے لئے مختلف لفظ استعمال کئے ہیں۔ ہندو انہیں اوتار یا رشی کہتے ہیں۔ رواقیین انہیں حکمائے سے موسوم کرتے ہیں، اسرائیلی انہیں انبیاء کا لقب دیتے ہیں اور اہل یونانی خاص کر سقراط و افلاطون انہیں فلاسفہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ افلاطون کے انسان کامل میں تمام تہذیبی اقدار کا ملاً متشکل ہیں۔ یہ محض منطقی، قیاسی اور خیال پرست نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین کو حقیقت کا رنگ دینے والا ہے، جس کو وہ صاف طور پر دیکھتا ہے، اور اس کو شخصی زندگی

اور اجتماعی تنظیم میں رو بہ عمل لے آتا ہے۔ اس لئے جب افلاطون سلاطین کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس کا مطلب مطلق العنان حکمرانوں سے نہیں ہوتا، جو قوت کو اپنے شخصی حوصلوں کی تکمیل میں استعمال کرتے ہیں، بلکہ یہ اعتدال پسند حکمران ہیں جو اپنے آزادانہ اختیار کے ساتھ انصاف کے نصب العین کو حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ اعلیٰ ذہانت کے انسان میلان عمل کے شہسوار اور بے داغ کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

یہ بات اب تاریخی حقیقت کا درجہ حاصل کر چکی ہے کہ بجز پیغمبر اسلامؐ کے دنیا کے زبردست روحانی رہنماؤں میں سے کسی اور نے ایک مثالی مملکت کے حصول کی کوشش نہیں کی۔ آپ ہی وہ فلسفی سلطان تھے جس کا خواب افلاطون نے دیکھا تھا۔ آپ انصاف کا بلند معیار رکھنے والے انسان تھے اور ساتھ ہی ایسے کردار اور اقتدار کے حامل تھے کہ ان معیاروں کو روبہ عمل لا سکیں اور اپنی زندگی ہی میں ان کی ممکنہ تکمیل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ نیز ان چیزوں کو اپنے جانشینوں اور آنے والے زمانوں کے لئے چھوڑ دیں تاکہ وہ رفتہ رفتہ حالات کے تقاضوں کے ساتھ آگے بڑھائیں۔ افلاطون نے صرف ایسی شہری مملکت کا خواب دیکھا جس کی تین چوتھائی آبادی ایسے غلاموں پر مشتمل تھی جنہیں واقعتاً کوئی شہری حقوق حاصل نہیں تھے۔ اس نے یونان کی دیگر شہری مملکتوں کو کسی نہ کسی طرح متحد کرنے کا ذہنی نقشہ تو قائم کیا تھا لیکن باقی تمام دنیا اس کے نزدیک جاہل و وحشی تھی اور کسی فکر و تدبر کے قابل نہ تھی۔ اور اس کے لئے یہی مناسب تھا کہ اس کو اپنے وحشیانہ طریقوں پر چھوڑ دیا جائے۔ یعنی غیر یونانی دنیا اس کی تصوریت میں شامل نہیں تھی۔

آنحضرتؐ اور افلاطون کی مثالی مملکت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آنحضرتؐ ایک عملی معیار پسند تھے۔ جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے آپ ناقابل حصول مطمحائے نظر کے قائل نہ تھے۔ آپ کے نزدیک تصوری اور ممکن العمل دونوں ایک نقطہ کی طرف مائل تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ انسانیت کے روبرو ایسے نصب العینوں کو پیش کرنا لاحاصل ہے جن کو وہ اپنی فطرت اور کوتاہیوں کے سبب واقعی زندگی میں تشکیل دینے کے ناقابل تھی۔ آپ اس تعلیم پر یقین رکھتے تھے کہ "خدا انسانوں پر ان کی استعداد سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتا، اور وہ انسان کے ایسے فطری تقاضوں سے واقف ہے جن سے کسی صورت میں مفر نہیں۔" دوسرا بڑا فرق آنحضرتؐ اور افلاطون میں یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے پیش نظر پوری انسانیت بحیثیت ایک عضویت کے تھی، جس میں ایک ذات واحد بصورت کثرت جلوہ گر تھی۔ قرآن پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے نہ کہ صرف کسی ایک شہر کے باشندوں کو۔ آنحضرتؐ مکہ اور مدینہ کی شہری مملکتوں کے کامیاب قیام پر مطمئن نہیں تھے اور نہ آپ اس پر مطمئن ہو گئے کہ جزیرہ نمائے عرب آپ کے زیر فرمان آچکا تھا۔ چنانچہ آپ نے جوں ہی اپنے وطن میں خود کو محفوظ پایا تو اطراف کی سلطنتوں کے حکمرانوں کے نام دعوت نامے جاری فرمائے جن میں اپنی اطاعت یا عرب کے اقتدار کو تسلیم کرنے کا مطالبہ نہ تھا، بلکہ اس نصب العین کو ماننے کی دعوت دی گئی تھی جو مختلف نسلوں اور مذہبوں کو باہم متحد کرتا تھا۔ وہ نصب العین تمام حقیقتوں کی وحدت تھی جسے خدا کہا جاتا ہے اور جو عام ہمدردی اور انصاف کے اعلیٰ ترین نصب العینوں کو اپنی ذات میں مجتمع رکھتا ہے۔ یہ دعوت سب کے لئے ایک نصب العین کی

پرستش کے لئے تھی تاکہ مذاہب اور اقوام کے اختلافات سے قطع نظر کر کے باہمی حق و انصاف پر عمل پیرا ہو سکیں۔ یہ اس دعوت کے مماثل تھی جو عیسائیوں اور یہودیوں کو دی گئی تھی کہ وہ ایسی چیز پر متحد ہو جائیں جو ان کے درمیان مشترک اساس ہو سکتی تھی اور جو اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ ایک خدا کی پرستش کو حقیقت کا رنگ دیا جائے جس سے تمام باہمی حق و انصاف بطور ضمنی نتائج کے پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام نیکی کو تمام انسانیت کا مشترک ورثہ تصور کرتا ہے اور قرآن نیکی کے لئے معروف کا لفظ استعمال کرتا ہے، جس کے معنے ایسے اوصاف کے ہیں جو عام شہرت رکھتے ہوں۔ اس کی تعلیم ہے کہ تمام انسانیت بھلائی کی آرزومند ہے، لیکن اس کے متعلق مبہم اور بعض اوقات غلط تصورات رکھتی ہے۔

اسلام کے نزدیک روحانیت دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک طرف تو یہ انسان کا اپنے معبود سے ایک شخصی ربط و تعلق ہے، لیکن دوسری طرف انسانیت اور معاشرہ کے ساتھ یہ اجتماعی حقوق اور فرائض کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ وہ انسان کامل طور پر روحانی نہیں ہوتا جو معاشرہ سے علیحدگی اختیار کر کے صرف اپنی شخصی نجات کا متلاشی رہتا ہے۔ اجتماعی رشتے اس کی شخصیت کے تار و پود ہوتے ہیں۔ مذہب کا مطلب کسی منھ یا غار میں بیٹھ کر مالا جپنا یا دھونی رمانا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسی باعمل معاشری زندگی کا نام ہے، جو نصب العین کی مطابقت میں بسر کی جاتی ہے۔ اس لئے اسلام ترکِ دنیا اور متصوفانہ توکل کو بے اعتبار ٹھہراتا ہے۔ اس کی فرض نمازیں تمام کی تمام اولاً جماعتی عبادات ہیں۔ اگرچہ ایک عبادت گذار کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ بعض اوقات خصوصاً رات کی خاموشی اور عزلت میں بھی خدا کی عبادت کرے۔ لیکن یہ روح کا استحکام و استغراق بھی زندگی کے عملی کاروبار میں نیک اعمال کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے۔

چنانچہ اسلام شاذونادر ہی فرد کے ساتھ بحیثیت فرد کے بحث کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کو ایک خاندان یا قوم کے رکن کی حیثیت سے دیکھتا ہے جو جائز محنت سے اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے، الکاسب حبیب اللہ، محنت مزدوری کرنے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے۔ حالیہ اشتراکیت اور اشتمالیت کے حامی برسرِ عام محنت کی عزت و توقیر اور اس اصول کا اعلان کر رہے ہیں کہ جو کوئی محنت نہ کرے وہ روٹی نہ کھائے۔ لیکن آنحضرتؐ نے خود مزدوروں کی طرح کام کر کے محنت کی عظمت و شان جریدۂ عالم پر تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ قبل ثبت فرما دی۔ یہ آپ ہی تو ہیں جن کا ارشاد ہے کہ پسینہ سوکھنے سے قبل مزدور کو اس کی اجرت حوالہ کر دو اور وہ شخص جو زمین کو کاشت کرتا ہے وہی زمین پر بہتر حق رکھتا ہے۔ آپ نے مزدوروں، کسانوں اور گلہ بانوں کی مملکت کی داغ بیل ڈالی، لیکن متدین تاجروں اور طالبان علم کو بھی محنت کرنے والوں میں شامل فرمایا۔ جس چیز کی آپ نے حوصلہ افزائی نہیں فرمائی وہ طفیلیت اور بغیر کمائی ہوئی آمدنی پر گذر بسر کرنا تھا۔ آپ دنیا میں پہلے اشتراکیت پسند معاشی ہیں جنہوں نے سرمایہ پر محصول عاید کیا اور کلانیت کے قانون کو برخاست فرمایا، جس کی رو سے مولود اکبر تو پوری جائیداد کا بلا شریک و سہیم وارث ہوتا تھا اور اس کے چھوٹے بھائی، بہن اور دیگر رشتہ دار محروم رہتے تھے۔

اسلام کو ایک ایسی دینی حکومت کے قیام کا الزام دیا جاتا ہے، جو سیاسیات، قانون سازی اور معاشیات میں دخل در معقولات

کرتی تھی۔ جس طرح حضرت عیسےؑ نے تہذیب کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا اور امور مملکت میں دخل اندازی کے آپ خلاف تھے ایسے ہی یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ ایک باخدا انسان کا سیاسیات اور معاشیات سے کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیئے۔ بس یہی کافی سمجھا جاتا تھا کہ وہ اخلاقی طور پر پاک ہے، اور بنی نوع انسان کے ساتھ خیر خواہی اور محبت کی تعلیم دیا کرے۔ بدھ مت جیسے ایک بڑے مذہب کے بانی کو ہم انسان کی حقیقی زندگی سے زیادہ مابعدالطبیعات کی جانب متوجہ پاتے ہیں۔ گوتم بدھ نے تمام مشہودات اور موجودات کو بے اصل ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ پوری زندگی کو ایک شر گردانا تھا، جو زندہ رہنے کی خواہش کی آفریدہ تھی۔ اور اسی لئے انسان کا مقصد عظیم خواہش کو کاملاً فنا کر کے تمام شخصی اور اجتماعی وجود سے چھٹکارا پانا قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے معلم کو معاشرہ کی اصلاح اور از سر نو تعمیر کا یا حقیقی یا مثالی مملکت کی سیاسیات سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا۔

اسلام کے منظر عام پر آنے سے قبل مذہب کا مفہوم صرف عالم آخرت کے معاملات سے تھا۔ قدیم عیسائی یہ یقین رکھتے تھے کہ دنیا کا خاتمہ نہایت قریب ہے اور کوئی چیز سوائے انابت و عبادت کے ایسے موقع پر کارآمد نہیں ہو سکتی۔ مملکت میں برائیوں کی بابت ان کا یہ خیال تھا کہ ان کا انسداد ان کے فرائض میں نہیں ہے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ "خطبۂ جبل" ظلم کو بھی بے چون و چرا قبول کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ "اگر تمہارے ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کو پیش کر دو"۔ اور اگر کوئی تمہارا کرتا چرالے تو کوٹ بھی اس کی نذر کر دو"۔ قوانین ملک کی اطاعت کے بارے میں جس میں کہ وہ رہتے تھے، انہیں حضرت عیسےؑ کے اس حکم کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی کہ "قیصر کی چیزیں قیصر کے حوالہ کر دو"۔ عقیدۂ رحم و شفقت جس کی حضرت عیسےؑ نے تبلیغ کی تھی وہ خاموشی کے ساتھ شر کو برداشت کرنے کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ وہ فطرت انسانی کی اس بنیادی حقیقت کو بھول چکے تھے کہ بلاتعرض شر کو برداشت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ خود شر کا ارتکاب کرنا۔ اور غلط انداز طور پر ظلم برداشت کرنے والے ہی ظالموں کی پرورش کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: "اگر کوئی آدمی برائی کو دیکھے تو اس کو عملاً دور کرنے کی کوشش کرے، اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو الفاظ کے ذریعہ اس کے خلاف احتجاج کرے، اگر وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تو دل میں اس سے نفرت کرے، جو ایمان کی کمزور ترین صورت ہے"۔ آپ افلاطون اور ارسطو سے اس امر میں متفق تھے کہ ایک منصف مزاج آدمی منصفانہ طریقہ پر صرف ایک عادل مملکت میں ہی رہ سکتا ہے اس لئے ایک عادل مملکت کا قیام معاشری عدل اور فرد کی خوشحال زندگی کے لئے ناگزیر شرط ہے۔ حضرت عیسےؑ کے اس قول میں بڑی صداقت تھی کہ آسمانی سلطنت خود تمہارے باطن میں ہے . . . . کیونکہ کوئی عدل پسند سلطنت ان غیر عادل آدمیوں سے نہیں بنائی جاسکتی، جو پہلے اپنے نفوس میں ایک آسمانی سلطنت کی تخلیق خود اپنی زندگیوں میں اس نصب العین کو بروئے کار لاکر نہ کر چکے ہوں۔ لیکن اسلام کہتا ہے کہ یہ کافی نہیں ہے۔ باطن کی آسمانی سلطنت کو خارج کی آسمانی سلطنت میں متشکل کرنا چاہیئے تاکہ انسان کی منظم زندگی محبت، اخوت، اور انصاف پر مبنی ہو سکے۔ اگر خدا کے نیک بندے انسان کی معاشری اور سیاسی زندگی کو اپنے حال پر تنہا چھوڑ دیں تو معاشی اور معاشری خرابیوں کے سبب نیک افراد کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جائیگی

چنانچہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ اگر معاشرہ میں چند آدمی برائی کرتے ہوں اور دوسرے ان کو روکنے کے لئے کچھ نہ کرتے ہوں تو نیک اور بد سب کے سب تباہی میں گھر جائیں گے کیونکہ نیکو کار محض خاموش تماشائی بنے رہے اور برائی کو روکنے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔"

اس لئے اسلام محض خدا پر ایمان لانا، اپنی روح کی حفاظت کے لئے اس کی عبادت کرنا، اور دنیا کی آلودگیوں سے پرہیز کرنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اوّلین مقصد زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر عملاً اور کاملاً نظر رکھ کر موجودہ زندگی کو بہتر بنانا ہے۔ موجودہ زندگی کو کل کائنات کی ابتداء وانتہاء فرض کرتے ہوئے کوئی بڑا مذہب بالکل غیر دنیاوی نہیں رہ سکتا۔ اس کا دنیاوی زندگی سے تعلق ہونا لازمی ہے۔ اسلام نے دونوں کا امتزاج کیا ہے۔ اور مابعد زندگی کا تعین یہاں کی زندگی کی حالت سے ہوتا ہے۔ "جو یہاں بے بصر ہے وہ آخرت میں بھی بے بصر رہے گا۔" جب آخرت کی زندگی میں نیکوکار بہشت کے ثمرات کا مزہ چکھیں گے تو کہیں گے کہ وہ اپنی سابقہ زندگی میں ان سے ملتی جلتی چیزوں سے لذت شناس ہو چکے ہیں۔" جو زندگی یہاں بسر کی جاتی ہے اس کی بنا عالمگیر محبت و انصاف ہونی چاہیئے جیسا کہ قرآن کہتا ہے "خدا کی رحمت ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔" اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ دعا مانگا کریں "خدایا! ہمیں یہاں کی زندگی کی خوشحالی اور آخرت کی زندگی کی خوشحالی عطا فرما۔" ہمیں اس دعا میں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اس دنیا کو ترجیح و تقدم زمانی حاصل ہے، اگرچہ کہ یہ قدر کے لحاظ سے نہیں ہے اور یہ زندگی ایسے اسباب پر مشتمل ہے جس کے نتائج آخرت کی زندگی میں دیکھے جائیں گے، اگرچہ کہ یہ ضروری نہیں کہ تمام نتائج آخرت کی زندگی ہی کے لئے اٹھا رکھے جائیں۔

چنانچہ اسلام کے نزدیک انسان ایک معاشری اور سیاسی وجود ہے، اس کی فلاح و بہبود معاشرہ کی فلاح و بہبود سے بندھی ہوئی ہے اور معاشرہ کی اعلےٰ ترین تنظیم مملکت ہے۔ اسلام کو ایک مملکت قائم کرنی تھی اور عملی شکل میں مملکت کے اعلےٰ نمونے دنیا کے سامنے پیش کرنے تھے۔ آخر کار انسان نے فلسفی سلطان کے تصور سے نجات پائی۔ یہ معاملہ انسانی معاشرہ کی دوبارہ تشکیل اور تفصیلی تحقیق کے لئے نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے کیا نصب العین ہیں اور زندگی میں کس طریقہ سے انہیں نظام سیاست کی تخلیق میں بروئے کار لایا جائے۔

یہ مسئلہ کہ مذہب کس طرح زندگی میں تخلیقی تحریک پیدا کرتا، جان ڈالتا اور سنوارتا ہے، قدرتاً اس سوال سے مربوط ہو جاتا ہے کہ زندگی کو معاشرہ کی اعلےٰ ترین تنظیم سے، جسے مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کس طرح تعلق رکھنا چاہیئے۔ جب ہم حقیقی تفصیل اور واقعات کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو غیر مرئی سلطنت کے تصور سے جن کا مقام الوہیت یا افلاطون کی مثالی شہریت یا ہمارے باطن میں آسمانی سلطنت ہوتا ہے ـــــــ ہماری تسکین خاطر نہیں ہوتی۔ ہر واقعی مملکت کسی نصب العین کی صورت پذیری کرتی ہے جس کو وہ ممکن العمل سمجھتی ہے، اور اس کی تمام سیاسی اور تہذیبی ساخت اور اس کے آئین کی نوعیت اسی پر منحصر ہوتی ہے۔ مملکت کے شہریوں اور مابقی انسانیت کی زندگی کے لئے یہ معاملہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ اس نصب العین

کی تعریف و تعیین کی جائے، جو اس کی زندگی میں تخلیقی تحریک پیدا کرے، اور خوشحالی کے تصور کو عملی صورت دیتا ہے اور جس کو مملکت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اسلامی حکومت کو اکثر مذہبی حکومت کہا جاتا ہے۔ اگر ہم دینی مملکت کو خالص دنیوی مملکت سے متمائز کرنے کے لئے اس کے مفہوم کی صاف طور پر تعریف کریں تو اس سے ہمیں ان امور کی توضیح میں بڑی مدد ملے گی۔ مذہبی حکومت وہ ہے جو اپنے تحدیدی اختیار کو کئی خداؤں یا ایک خدا یا ان مذہبی اصول سے حاصل کرتی ہے، جو بطور انضباطی قوتوں کے عمل کرتے ہیں۔ تمام قدیم ملتیں مرئی اور غیر مرئی عناصر رکھتی تھیں۔ ایک قبیلہ کا مرئی اور غیر مرئی حکمران ہوتا تھا، قبیلہ کے رسم و رواج کو غیر مرئی قوتوں کی تقدیس و توثیق حاصل تھی اور ان ہی کے ذریعہ قبیلہ باہم مرتبط رہتا تھا۔ رسم و رواج کا یہ میلان ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی قوت فراہم کرے اور ان مذہبی معتقدات کے بعد بھی جنہوں نے انکی توثیق کی تھی، لیکن بعد میں خود کمزور اور متزلزل ہو گئے، اپنی قوت کو جمود کے ذریعہ جاری رکھیں۔ قبائلی استحکام کا کسی غیر مرئی بنیاد پر قوی عقیدہ سے زیادہ طریقہ ہائے زندگی اور رسوم و روایات پر انحصار ہوتا ہے۔ ایسے فرقے جب وہ تنظیم کے کسی درجہ تک ترقی کرتے ہیں تو پیشوایان مذہبی کے طبقہ کو وجود بخشتے ہیں۔ مذہبی پیشوا قبیلہ اور غیر مرئی حکمران کے مابین وسیلہ ہوتا تھا، تاہم ہر ترقی یافتہ قبیلہ اپنے مذہبی پیشوا رکھتا تھا۔ قدیم تہذیبوں میں مذہب و سلطنت، یا مذہبی اور غیر مذہبی قانون کے درمیان ہنوز کوئی تفریق نہیں تھی۔ قدیم قبیلہ میں فرد کی ہستی ابھی وجود میں نہیں آئی تھی، (کوئی شخص رائے و عمل کے مرکز کی حیثیت سے ہنوز کوئی وجود نہ رکھتا تھا)، کوئی شخصیت بجز قبائلی شخصیت کے نہ تھی اور قبیلہ کا نفع و ضرر اجتماعی صورت رکھتا تھا۔ یہ قدیم مذہبی اشتمالیت تھی جس سے انسانی معاشرہ کا آغاز ہوا۔ خدایان باطل یا غیر مرئی قوتیں قبائلی رسم و رواج کے محافظ و نگران تھے۔ سردار قبیلہ اپنے نام پر حکومت نہیں کرتا تھا بلکہ قبیلہ کی شخصیت کے نام پر جسے فوق البشر حیثیت میں الوہیت کا درجہ دیا گیا تھا حکومت کرتا تھا۔ زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں میں مذہب و سلطنت کا تعلق مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا . . . . قدیم ہندو سلطنت اور ہندو تہذیب دینی حکومت تھی۔

رسم پرستانہ مذہب جس قدر عسیر الفہم الہیات، علم کائنات، اور مسائل معاد سے پیچیدہ ہوتا گیا، پیشوایان مذہب کی جماعت ابھرتی گئی، جو یہ سمجھتی تھی کہ اسے غیر مرئی قوتوں پر تصرف حاصل ہے۔ زندگی کا ہر فعل مذہبی عمل تھا جس کی توثیق برہمنی پیشوائیت سے ضروری تھی۔ برہمن قانون و رواج کے محافظ اور قانون ساز تھے۔ حکمران اپنا اختیار ان سے حاصل کرتے تھے اور تخت پر بیٹھنے سے پہلے انہیں ان کے آگے زمین بوس ہونا پڑتا تھا۔ ہر اہم موقع پر دنیوی حکمران کو برہمن کی پوجا پاٹ کرنی پڑتی تھی، تمام سیاسی فیصلوں میں اس کی آواز سب سے زیادہ وزن رکھتی تھی۔ وہ آئین و ضوابط جو تمام اخلاقیت اور تمام رسوم کا انضباط کرتے تھے، شاستر تھے جن میں اخلاقیات، الہیات اور قانون کے درمیان ہنوز کوئی تفریق نہ کی گئی تھی۔ منو کا دھرم شاستر ہندو تقلید پرستی کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ نکاح۔ وراثت۔ تجارت۔ نسب، ضوابط اور غذایات غرض یہ کہ زندگی کا ہر پہلو مذہبی آئین و ضوابط سے گھرا ہوا تھا۔ جب تک کہ ہندو سوسائٹی کی کالاً قلب ماہیت حد شناخت سے باہر نہ ہو جائے یہ از سر تا پا دینی حکومت رہے گی برہمنیت کسی دوسرے بڑے مذہب سے زیادہ طویل عمر رکھتی ہے وہ اپنے حق و اقتدار پر حملہ آور قوتوں کی مقاومت کرتی رہی ہے

کپلنگ نے مشرق کی بابت یہ کہا تھا کہ یہ ہر انقلاب اور فتح کے جھونکے کے آگے ایک بردبارانہ گہری حقارت کے ساتھ سرنگوں ہو جاتا ہے۔ اور اس کے گذر جانے کے بعد پھر اپنے خیالات میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ یہ معتقدات کے کسی مقررہ نظام پر زیادہ مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کا نتیجہ نہیں بلکہ مذہبی توثیق شدہ روایات کی قوت تھی، جو ایسی چٹان کی مانند طوفانوں میں رہتی ہے جس کے خلاف امنڈتا ہوا طوفان اپنے غم و غصہ کو جھاگ کی صورت میں اس کے قدموں پر ڈال دیتا ہے۔ بحیثیت کسی مخصوص مذہب یا نظام معتقدات کے جس کو اس کے پیروؤں کی اکثریت مانتی ہو، ہندو مذہب کی تعریف کرنا ناممکن ہے۔ فلسفیانہ وحدتِ وجود یا توحید پرستی سے لے کر انتہا درجہ رکیک اصنام پرستی، فطرت پرستی، بت پرستی یا اشیا پرستی تک یہ تمام چیزیں ان کے مذہب میں داخل ہیں۔ ہندوؤں میں کسی مشترک عقیدہ کو تلاش کرنا گویا گھاس کے انبار میں سوئی کو ڈھونڈنا ہے۔ اور یہ جستجو لاحاصل ہوگی۔ کسی کلبی نے فلسفیوں کی بابت کہا ہے کہ یہ مثل نابینا انسانوں کے ہیں جو اندھیرے میں گربہ سیاہ کو ٹٹول رہے ہیں جس کا کہیں وجود نہیں۔ اور یہی حال ہندوؤں میں مشترک عقائد کا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں میں پاکیزہ روحانیت کے کچھ اعلیٰ نمونے مل سکتے ہیں مگر دوسری طرف تم ان میں سے ایسے فرقے بھی موجود ہیں جو غلامت پرستی پر عمل کرتے اور انسان کو بھینٹ چڑھانے تک کے قائل ہیں۔ ہندومت بحیثیت روحانی اور اخلاقی اصول کے، جیسے اس کے بڑے بڑے رشیوں اور منیوں نے ترقی دی تھی، کبھی کامیابی کے ساتھ ادنیٰ اور وحشیانہ طریقوں کو رد نہ کر سکا۔ اس کا کچھ تو سبب یہ تھا کہ برہمنوں نے کرما اور ذات پات کے نظریوں کو ترقی دی تھی جو ذات سے خارج اشخاص کے لئے کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہ کرتے تھے۔ اور اس طرح پادتی درجہ کے انسان مصائب و آلام میں زندگی بسر کرتے تھے، کیونکہ یہ اس کے مستوجب سمجھے جاتے تھے۔ ان کو روحانی طور پر ابھارنے کی کوئی کوشش مہاپاپ سمجھی جاتی تھی، اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جاتیوں کے علیحدہ رکھنے کے خدائی منصوبہ میں یہ ایک طرح کی دخل اندازی ہے۔ ہندو پیشوائیت میں ایک اور امتیازی چیز ہے، جس کی مثال دوسری تہذیبوں میں ملنی مشکل ہے، جہاں تک عالم غیب کے معتقدات کا تعلق ہے یہ تمام مذہبی پیشوائیت میں سب سے زیادہ بے تعصب اور وسیع المشرب ہے نہ صرف پیشوایان مذہبی بلکہ عام طور پر ہندو سوسائٹی معتقدات کے معاملہ میں غیر جانب دار ہے۔ تم جس چیز پر چاہو ایمان لا سکتے ہو، یا چاہو تو کسی چیز پر بھی ایمان نہ لاؤ۔ ایک منکرِ خدا ایسا ہی بہتر ہندو ہو سکتا ہے، جیسا کہ ایک ویدانتی اہل باطن یا ٹیگور یا گاندھی جیسا ایک خدا پرست حال ہی میں رسوم و روایات اور ہندو اتحاد کے غیر معین اعتقاد کو تقویت قومی جذبہ سے ہوئی ہے، جو مغرب کے تصادم کا نتیجہ ہے اور جس سے ہندو سوسائٹی باہم مربوط ہوئی ہے، ورنہ اس میں کوئی اندرونی یا عضوی وحدت نہیں ہے۔

گاندھی کی قیادت نے ہندو فرقوں میں جوش و قوت پیدا کر دی مگر اب تک پوری طرح یہ ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ وہ مذہبی آدمی تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ذات پات کے طریقوں میں ظلم و زیادتی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ

انتہاپسند مصلحین اس معاملہ میں اس سے بھی زیادہ تشدد چاہتے تھے اور اس خرابی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر راست حملہ کے خواہشمند تھے۔ مذہبی اور معاشری حیثیت سے یہ شخص انقلابی نہ تھا۔ اور جس مملکت کا خاکہ اس نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ اس کو رام راج کہتا تھا جو ایک حیثیت سے مذہبی اساس رکھتی تھی۔ لیکن اس کا رام راج ایسا کوئی مذہبی آئین نہ رکھتا تھا جس پر کہ وہ چل سکے اور نہ کوئی ایسا مذہب تھا جو مملکت پر فرمانروائی کر سکے۔ اس نے کئی ایسے متناقض تصورات رکھنے والے جتھے چھوڑے جو اسے بحیثیت ایک گرو کے مانتے ہیں۔ لیکن مختلف فرقے اس کے نام پر تشدد کے ساتھ باہم دگر دست و گریباں ہیں۔ نہرو جس کے کندھوں پر اس کی ردائے سیاسی ڈالی گئی ہے کوئی مذہبی آدمی نہیں ہے۔ یہ اس کے تکرار و اعادہ سے کبھی نہیں تھکتا کہ مملکت بالکلیہ غیر مذہبی ہو اور کسی مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن راجگوپال اچاریہ جو گاندھی کے مخلص چیلوں میں سے ہے کہتا ہے کہ مملکت کا پس منظر اور اساس مذہب کو ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بغیر مذہب کے معاشرہ اور مملکت میں عدم موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ ہندوستان غیر مذہبی حکومت کا دعویدار ہے اور پاکستان کو مذہبی اساس اختیار کرنے پر مطعون کرتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں ہندوستان پاکستان سے کہیں زیادہ مذہبی ہے۔ کیا کوئی سلطنت حقیقتاً دنیوی کہلا سکتی ہے جبکہ اس کے باشندوں کی زندگی پر مذہبی روایات، رسومات اور تعصبات کی حکمرانی ہو۔ رسم پرستی ہندوؤں کی معاشری زندگی میں یہودیوں سے بھی کہیں زیادہ رچی ہوئی ہے۔ مذہبی روایات انہیں پیدائش سے قبل ہی اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ ان کی پیدائش مذہبی رنگ کی ہوتی ہے۔ اور ان کی اجتماعی حیثیت کا تعین کرنا اور ذات پات کے قاعدوں سے ہوتا ہے۔ ان کا کھانا پینا، حجامت بنانا۔ نہانا، شادی بیاہ کرنا اور مرنا سب مذہبی ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ ان کا پاپ بھی دھرم ہی سے ہوتا ہے۔ نہرو کہتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب کا غالب رنگ اور امتیازی نشان ہندو ہوگا۔ اور ہندو تہذیب خالصتاً مذہبی ہے۔ تمام مملکتوں کی تعمیر ان کے جمہور کی نفسیات پر ہوتی ہے۔ آئین و دستور جمہور کی نفسیات سے علیحدہ ہو کر جن کے لئے وہ بنائے جاتے ہیں، ایک لفظی وجود رکھتے ہیں جو زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکتے۔ گائے کا احترام جس میں بہت سے ہندو باہم متحد ہیں، تعزیری قانون کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس میں ایسی گائیں بھی شامل ہیں جن کو باقی رکھنا انتہائی غیر کفایت شعارانہ ہے۔ اور ایسے غریب کسان پر یہ ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے جو خود کو اور اپنے خاندان کو فاقہ کشی سے بچانے کے لئے ہولناک کشمکش میں مبتلا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ سے جو سختی کے ساتھ مذہبی روایات، رسومات اور تعصبات میں جکڑا ہوا ہو۔ یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مساویانہ شرائط پر بھائی چارہ کر سکے گا۔

موضوع سے اس انحراف کے بعد ہم کو اپنے مقصد یعنی دینی اور دنیوی مملکتوں کی زیادہ واضح الفاظ میں تعریف کی طرف رجوع ہونا چاہیئے تاکہ ہم اپنے اصل موضوع اسلام اور اسکی امتیازی قسم کی دینی حکومت کی طرف متوجہ ہوں۔ حکومت الٰہیہ وہ حکومت ہے جس کی ظاہری و پوشیدہ اساس مذہبی ہو۔ دینی حکومتیں مخصوص مابعد الطبیعاتی معتقدات کی حامی ہوتی ہیں، یہ معتقدات یا تو ضابطہ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں یا ان کی تشکیل قدیم رسم و رواج یا روایات میں ہوتی ہے۔ دنیوی مملکت وہ ہے جس میں

یا تو تمام رعایا کی فلاح و بہبود یا مخصوص طبقوں کی خوشحالی مدِ نظر ہوتی ہے۔ یہ اپنے قوانین یا تحدیدات کسی فوق العقل الہامی ذریعہ سے اخذ نہیں کرتی یہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی میں آزاد ہوتی ہے۔ اگر یہ انتہائی ترقی یافتہ مملکتیں ہوں تو وہ چند بنیادی حقوق و فرائض بلا کسی خدا یا خداؤں یا الہامی ذریعہ کے حوالے کے اپنے باشندوں کے لئے معین کرتی ہیں۔ ایسی مملکتیں اپنے باشندوں کے درمیان نسلی یا مذہبی معتقدات کی بناء پر فرق و امتیاز نہیں کرتیں۔ چونکہ دنیوی حکومت مذہب سے لاپرواہ ہوتی ہے اس لئے وہاں مذہبی آزادی زیادہ ہوتی ہے۔ مملکت کی خدمت یا تمام حقوق یا رعایتوں کے لئے مذہب کسی شہری کے حق میں نفع و ضرر نہیں ہوتا۔ یہ دنیوی مملکت کے دعووں کے نمایاں خد و خال ہیں۔

جس طرح ایک دینی حکومت مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے اسی طرح ایک دنیوی حکومت بھی کر سکتی ہے۔ محض دنیویت کسی مخصوص خیال پرستی کی ضامن نہیں۔ موجودہ زمانہ کی زیادہ تر حکومتیں عملی اعتبار سے دنیوی ہیں لیکن ان کے خوشحالی کے تصورات اور طریق کار میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ کسی مملکت کا جمہوری یا دنیوی کہلانا ترقی یافتہ اور خوشحالی ہونے کی علامت بن گیا ہے۔ ایسی مملکت جو تمام باشندوں میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتی ہو وہ صریحاً مذہب کو اپنی اساس نہیں بنا سکتی۔ اگرچہ انگلستان اور ممالک متحدہ کے بڑے مدبرین کبھی کبھی اپنے اہل مملکت پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور باقی دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی تہذیب عیسائی تہذیب ہے اور ان کا مقصد زندگی کے ہر پہلو میں عیسائی تصورات کو روبہ عمل لانا ہے۔ لیکن یہ عیسائی تصورات کی تفصیلی تعریف کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ اس سے شدید بحث و مباحثہ کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔ بشمول دیگر نعروں کے اس کی قدر بھی غیر معین ہونے میں مضمر ہے۔ عام تخیلی اور مبہم اصول پر اتفاق آسان ہوتا ہے۔ دشواریاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کوئی کسی عام صداقت کے ٹھوس مضمرات کو جو پیش پا افتادہ اور فرسودہ بن چکی ہو، استدلال اور اخلاص سے پیش کرنا چاہتا ہو۔ باہم مخالفانہ نظامات بھی ایک ہی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں چنانچہ تقریباً سب کے سب خود کو جمہوری اور لادینی کہتے ہیں۔ جمہوریت مبہم ترین تصور بن چکا ہے۔ ہٹلر کی نازیت جمہوریت کی دعویدار تھی اور اکابر نازی دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ ہٹلر کا انتخاب آزادانہ جمہوری طریقہ پر رائے شماری کے ذریعہ بحیثیت قائد قوم ہوا ہے اور وہ قوم کی آواز و ارادہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہودیوں کی عقوبت و تعذیب اس جمہوریت کا مظاہرہ تھی، کیونکہ یہ مشتعل اکثریت کی خواہش تھی جس نے اپنا فیصلہ مزعومہ قومیت دشمن اقلیت کے خلاف صادر کیا تھا۔ فاشسٹ بھی اس بات کے دعویدار تھے کہ انہوں نے ایک خاص نمونہ کی جمہوریت ایجاد کی ہے، جو اینگلو امریکی قسم سے مافوق ہے۔ مسولینی کے قول کے مطابق اینگلو امریکی جمہوریت مامون اور مرفہ الحال قوموں کی عیش پسندی ہے اور غیر مامون و نادار قومیں اس کی نقل نہیں کر سکتیں۔ روسی اشتمالیت موجودہ نظامات میں سب سے زیادہ جمہوری ہونے کی دعویدار ہے، یہ اینگلو امریکی جمہوریت کو دولت مندوں کی حکومت کہتی ہے، جہاں بلاواسطہ یا بالواسطہ سرمایہ حکمران اور محنت پامال ہے۔ برطانوی اور امریکی روسی اشتمالیت کو ہمہ گیریت (TOTALITARIANISM) سے تعبیر کرتے ہیں، جہاں ریاستی سرمایہ داری کا غلبہ اور یک جماعتی تسلط فرد کو اپنے بنیادی حقوق سے محروم رکھتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لادینیت اور عمومیت

مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہیں۔ جرمن فلاسفہ مثل ہیگل اور فشتے نے اپنے نظریات میں مملکت کی پرستش اور جرمن قوم کے عالمی مشن کا ڈھنڈورا پیٹا۔ یہ لادینیت تھی جو قومیت کے روپ میں پھیل گئی تھی۔ نیٹشے کی طرح منکرین احساس کے بعد تو اسپنگلر نے بڑے صاف طریقہ پر بطور بنیادی سیاسی قدر کے قوت و طاقت کی تبلیغ کی۔ ہٹلر نے نسلیت کو قائم کرنے کے لئے تمام دینی اور مذہبی تعلقات فکر کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن خدا کو بحیثیت آریائی نسل کے کائناتی کفیل کے باقی رکھا جاتا، جو اس کے نزدیک برگزیدہ قوم تھی۔ یہ دراصل یہودی تصور کی مختلف پیرایہ میں تعبیر تھی اور اسکو وہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ لادینیت اتحاد جبر تعمیر پر تعمد ہے اور کئی شکلیں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سرمایہ داری نسلیت، پرولتاریت ر   (اشتراکیت یا اشتمالیت) کا وسیع مذہب انسانیت کا عقیدہ ہو سکتا ہے جو اصلاً تمام انسانی حقوق کا تحفظ کرے اور جو اعتدال پسند قومیت کو انسان دوستی یا بین الاقوامیت کا لازمی جزو سمجھتا ہے۔ جب تک کہ ہم ان کھوکھلے مفروضات اور عملی اطلاقات کو نہ سمجھیں محض نعروں سے ہمیں کوئی روشنی حاصل نہیں ہو سکتی

اب ہم اپنے اصل مسئلہ اسلام اور مملکت کے باہمی تعلق پر بحث کریں گے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اسلام اپنے آپ کو روحانیت یا اخلاقیت یا فرد کی نجات تک بحیثیت علاحدہ وجود کے محدود نہیں رکھتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کی خودی کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن وہ معاشرہ میں زندہ رہتی، حرکت کرتی اور اپنا وجود رکھتی ہے اور یہ معاشرہ ہی ہے جو خودآگاہی کی تخلیق کرتا اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔ تمام اخلاقیت ایک معاشری نسبت رکھتی ہے۔ اسلام ہمیشہ معاشرہ کے اندر انسان سے بحث کرتا ہے۔ اس کے نزدیک صرف معاشری عدل ہی تمام اشیا کی طرف بڑھنے کا زینہ ہوتا ہے۔ اسلام نے کسی فرد کو محض ہمسایہ سے محبت کی تعلیمات کے ساتھ نہیں چھوڑ دیا ہے۔ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم تمام بڑے مذاہب نے دی ہے اگر کسی مذہب نے اسلام سے قبل بالکل آغاز ہی سے یہ کوشش نہیں کی کہ معاشرہ کی تنظیم ایک فلاحی مملکت کی صورت میں کرے۔ اسلام نے واقعتاً ابتداء اس نظم فکر پر ایک مملکت کی بنا ڈالی اور اس کو ایک مثالی مملکت فلاح و خیر کی صورت دی۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم اظہار خیال کر چکے ہیں کہ افلاطون کا فلسفی ایک بادشاہ بن بیٹھا جس نے ایک تخیل پیش کی تھی کہ بھلائی کیوں ایک مملکت کا قیام ضروری ہے۔ اگر عوام معاشری عدل کے تصورات سے مستفیض ہوں اور ٹھوس نتائج حاصل کرنا چاہیں تو انہیں منظم ہونا چاہیئے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہیں خود کو منظم کرنا پڑے گا۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں خلاف عقل جانبداریوں اور بے قید محرکات کا تسلط ہو اور جو افراد و جماعات کے مستقل مفادات سے گھری ہوئی ہو تو ایسی تخیل پرست جماعت کو خود اپنے وجود ہی کے لئے جنگ آزما ہونا پڑے گا۔ اسلام کے معنی صلح و امن کے ہیں، اور جنگ امن کی نقیض ہے۔ اسلام نے دنیا کو جنگ کا ایک معقول تصور عطا کیا ہے۔ جنگ ایک اجتناب کرنے کی چیز ہے لیکن اگر جنگ ہی کسی بڑی برائی کو روک سکتی ہے تب وہ سب سے بڑا فرض بن جاتی ہے۔ جب امن قائم ہو جائے اور حقوق حقیقت کا تحفظ ہو جائے تو فوراً تلوار نیام میں کر لینی چاہیئے۔ اسلام دس سال سے زائد عرصہ تک وحشی ستم رانوں کا تختۂ مشق بنا رہا جن کے ہاں انسانی زندگی اور اس کے اقدار کا کوئی احترام نہ تھا۔ جب وہ بے بسوں اور کمزوروں کی حفاظت اور مظلوموں کو

ظلم کے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کی کافی قوت فراہم کر چکا تو اس نے اپنے تبعین کو اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا جب تک کہ امن برقرار اور انسانی آزادی محفوظ نہ ہو جائے۔ مگر چونکہ یہ ایک مذہبی تحریک تھی اگر دین کی نشر و اشاعت کے لئے جنگ کی اجازت دی تھی۔ قرآن نے اس اصول کا اعلان کیا لا اکراہ فی الدین ۔ دین میں جبر و استکراہ نہیں ہے۔ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بعض اوقات ایسے غیر مسلم تھے جو ان حضرات کے گھروں پر خدمتگار تھے لیکن انہیں اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا

مسلم مملکت چند معین اصولوں پر قائم کی گئی تھی۔ چونکہ اسلامی مملکت کا قیام مذہبی اساس پر تھا، اس کو مذہبی حکومت کہنا حق بجانب ہے لیکن محض یہ اصطلاح کچھ مفید مطلب نہ ہو گی جب تک کہ ہم نہایت تفصیل سے اس کی تعریف نہ کریں۔ مسلم مملکت کے جس کو آنحضرتؐ نے قائم فرمایا اور جس کو مزید ترقی آپ کے قریبی جانشینوں نے دی ہے یہ اساسی اصول عطا کئے ہیں ۔

۱ - دیگر پیروان مذہب کی طرح مسلمان بھی مذہبی آزادی سے مستفید ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر انہیں ستایا جائے اور وہ اپنی زندگی اور ناموس کی مدافعت کے لئے کافی قوت نہ رکھتے ہوں تو انہیں اپنے مذہب پر قائم رہ کر صبر کے ساتھ مصائب جھیلنا چاہیے ۔

۲ - اگر ان کے صبر و تحمل کا جام لبریز ہو جائے اور وہ مقاومت کے ناقابل ہوں تو انہیں دار ظلم سے ہجرت کرنی چاہیے۔ انہیں کہیں اور پناہ دینے کے لئے خدا کی زمین کافی وسیع ہے۔ ان احکام کی رو سے سابقین اسلام کو حبشہ اور بعد ازاں مدینہ اور دیگر مقامات کو ہجرت کا حکم دیا گیا ۔

۳ - وہ خود اپنے اور دوسروں کے لئے امن و امان کی سازگار فضا پیدا کرنے کے لئے غیر مسلموں سے معاہدات قائم کرنے کی کوشش کریں۔

۴ - وہ ان عہدناموں کی پابندی کریں جو اگرچہ ہر لحاظ سے ان کے لئے اطمینان بخش نہ ہوں۔ عہدنامہ کی کسی شرط کی خلاف ورزی بہت بڑی معصیت ہے۔ اگر انہیں معاہدہ کرنے والی دوسری جماعت سے عہد شکنی کا یقین ہو جائے تو وہ عہدنامہ کو ختم کرنے کے لئے ایک مدت معین کر کے دوسرے فریق کو مطلع کریں۔

۵ - جب انہیں اپنی حفاظت کے لئے کافی قوت حاصل ہو جائے تو ان کو مناسب حدود سے تجاوز کئے بغیر زیادتی کرنے والوں کے خلاف قوت کے استعمال کرنے نیز ضروری حقوق کے تحفظ اور مخالف کے بالکلیہ مغلوب ہونے تک لڑنے کی اجازت ہے ۔

۶ - اگر غیر مسلم مملکت کی پر امن اور وفادار رعایا بن جائیں تو انہیں مذہبی اعتقاد کی کامل آزادی عطا کی جائے۔ ایک قلیل اور واجبی ٹیکس کے عوض جو وہ اپنی مملکت کو ادا کریں گے، قانون کی نظر میں ان کی مساوات کی ضمانت دی جائے۔ چنانچہ ایک غیر مسلم خلیفہ کے خلاف بھی عدالت میں رجوع ہو سکتا ہے۔ اور ابتدائی خلفاء کے عہد میں واقعتاً ایسی صورتیں رونما ہوئی تھیں۔ کسی مسلمان کو غیر مسلم کے خلاف مراعات دیے جانے کی اجازت نہ ہوگی ۔

۷ - مسلم مملکت ایک اشتراکی جمہوریت ہوگی۔ اسلام میں شاہیت کا کوئی مقام نہیں، اور نہ موروثی جانشینی کو کسی قسم کی

تائید حاصل ہے۔ یہ ایک مذہبی حکومت ہوگی جس میں کوئی پاپائیت یا مذہبی لوگوں کی جماعت حاوی نہ ہوگی۔ یہ صرف اس مفہوم میں مذہبی حکومت ہوگی جو اپنا اقتدار خدا سے حاصل کرتی ہے۔ خدا عالمگیر اجتماعی عدل کی ایک علامت ہوگا۔

۸ - دستور کے بنیادی اصول تمام رعایا کو مساوی شہری حقوق کی ضمانت دیں گے۔ تمام غیر مسلم مذہبی فرقوں کو یہ حق رہے گا کہ وہ اپنے مقدمات کا تصفیہ اپنے شخصی قوانین کی رو سے کریں بشرطیکہ ان سے ابتدائی حقوقِ انسانیت کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

۹ - قانون کے تحت عورت اور مرد یکساں بنیادی حقوق سے مستفید ہوں گے۔ عورت کو اپنے نام پر املاک و جائیداد رکھنے کی اجازت ہوگی۔ نکاح ایک معاہدہ کی نوعیت رکھے گا جس میں کسی قسم کے بھی شرائط داخل کئے جا سکیں گے بشرطیکہ وہ خلاف اخلاق اور خلاف آئین نہ ہوں۔

۱۰ - قوم کی معاشیات کا انضباط اس طرح پر ہوگا کہ سرمایہ داری اور غیر کمائی ہوئی آمدنی پر زندگی بسر کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی۔

۱۱ - قانون کلانیت جس کی رو سے خلف اکبر تمام جائیداد کا وارث قرار پاتا ہے، برخاست کر دیا جائے گا۔

۱۲ - سرمایہ پر محصول وصول کرنا لازمی ہوگا تاکہ اس کی گردش موقوف نہ ہو یا یہ جمع نہ ہوتا رہے۔ اس محصول کا اصل مقصد مصیبت زدوں کی امداد کرنا اور معاشرہ کو تدریجاً ایک سطح پر لانا ہے۔ یہ محصول ان سے لیا جائے گا جو مالدار ہیں، اور ان پر خرچ کیا جائے گا جو نادار ہیں۔

۱۳ - تمام باشندوں کی فلاح و بہبود مملکت کا اصل مقصد ہے۔ یہ محض انتظامی مملکت نہ ہوگی جس کے فرائض نظم و ضبط کے حاصل ہو سکنے ہی ختم ہو جائیں۔ اسلامی مملکت دراصل فلاح و بہبود عامہ کی حکومت ہے۔

۱۴ - کسی مسلم یا غیر مسلم باشندہ سے اس کی استطاعت سے زیادہ حاصل نہ کیا جائے گا۔ جو روزی کمانے کے ناقابل ہیں۔ وہ کوئی محصول ادا نہ کریں گے، بلکہ دوسری طرف ان کی بیت المال سے مدد کی جائے گی۔

۱۵ - تجارت کی آزادی ہوگی، لیکن سٹہ بازی کی ممانعت۔ نفع بازی کے لئے اشیائے تجارت کا احتکار غیر آئینی سمجھا جائے گا۔

۱۶ - مال و دولت کی معاشرہ میں ریل پیل ہوگی۔ مشترکہ خاندانی نظام میں جائیداد کو غیر منقسم رکھنا خلاف قانون ہوگا۔ صاحبِ املاک کے انتقال پر اس کی جائیداد قریبی رشتہ داروں پر تقسیم ہوگی تاکہ سرمایہ معاشرہ میں پھیلے اور اس کے فوائد سے زیادہ لوگ متمتع ہوں۔

۱۷ - صدر جمہوریہ کے انتخاب کے لئے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا گیا۔ فہرست اسماء میں سے صدر کے انتخاب کی سفارش کی جا سکتی ہے مگر قوم کی توثیق کے بغیر کسی جانشین کو نامزد کرنے کی اجازت نہیں۔ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدینؓ کے طریقِ عمل سے یہ اصول منضبط کئے گئے ہیں۔ ہر شخص کو انتخاب کئے جانے اور رائے دینے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ وہ ذہنی اور اخلاقی حالت کی

صحت کے بنیادی شرائط پورے ہو سکتا ہو۔ ہر باشندہ مملکت صدر حکومت کے کسی فعل پر باز پرس کر سکتا ہے اور یہ اس کا فرض ہوگا کہ اپنے فعل کو حق بجانب ثابت کرے۔

۱۸ - اسلام کی رُو سے اقتدارِ اعلیٰ کسی بادشاہ یا جماعت کو حاصل نہیں اور نہ قوم کو اس کا حق پہنچتا ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ خدا کو حاصل ہے اور معاشری عدل کا استخراج خدا کی صفات سے ہوتا ہے۔ یہ اقتدارِ اعلیٰ صاحبانِ اخلاق و صداقت کے تفویض ہوا ہے۔ مملکت کے بنیادی اصول کا حکم خدا نے دیا ہے اور قانون سازی کے بنیادی اصول بھی اسی کے منظور شدہ ہیں۔ حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ علماء کے اتفاقِ آراء سے جدید قانونی مطابقت کی اجازت ہے۔

۱۹ - اسلامی مملکت ایک مقررہ قاعدوں کی متابعت کرے گی، یہ نظام ظاہر و آشکارا ہے، اسرار اور سربستہ نہیں۔ مسلمان وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے قانون سازی میں آزاد ہیں، لیکن کوئی قانونِ اساسی (دستور) کو توڑ نہیں سکتا۔ وہی اشخاص قانون و ضوابط کی تدوین کے مجاز ہیں جو اسلام کی روح اور معاشری عدل کے اصول کو کما حقہ سمجھ چکے ہیں۔ مملکت میں علماء قوانین کی تشریح اور نظرِ ثانی کو جاری رکھیں گے اور جاہل عوام کی رائے سے متاثر نہ ہوں گے جو محض بے شعور اکثریت پیدا کرتے ہیں۔

۲۰ - بین الاقوامی صلح و امن کے لئے تمام مساعی کی جائیں گی۔ قرآن صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اگر دو جماعتوں میں سخت تنازعہ پیدا ہو جائے تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ درمیان میں پڑ کر صلح و صفائی کی پوری کوشش کرے۔ اگر ان ساری کوششوں کے بعد بھی کوئی جماعت ظلم و زیادتی یا اختلاف پر اڑی رہے تو مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ مظلوم کی حمایت کریں اور اپنی متحدہ قوت سے ظالم کو مغلوب کریں۔ مجلس اقوام اور اس کے بعد اقوامِ متحدہ نے صرف نظری طور پر ہچکچاتے ہوئے ان اصولوں کو ذہنی تحفظات کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اگر بین الاقوامی اخلاقیت ان اصولوں کو یقین واثق کے ساتھ اختیار کرے اور ان کو روبہ عمل لانے کے ذرائع اور طریقے معلوم کرے تو ظلم و زیادتی کا فوری قلع قمع ہو سکتا ہے اور اگر ظالم سر اٹھائے تو اس کو مؤثر طریقہ پر کچلا جا سکتا ہے۔

۲۱ - ظالم حکومت کے خلاف بھی اہل ملک کی کسی جماعت کو اسلام مسلح بغاوت کا حق عطا نہیں کرتا۔ یہ اصول تمام ممالک کی انقلابی جماعتوں کو ناخوشگوار معلوم ہوگا۔ لیکن اسلام بحیثیت ایک عالمگیر مذہب ہونے کے، ہر کسی چیز سے زیادہ امن و امان کا قدر دان ہے اور بے جا تشدد کی ممانعت کرتا ہے۔ اگر ایک مظلوم جماعت ستائی گئی ہے یا اس کے خلاف امتیاز برتا گیا ہے تو وہ تشدد اور مسلح بغاوت کو چھوڑ کر خرابیوں کی اصلاح کے لئے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کر سکتی ہے۔ شروع میں تمام پُرامن اور آئینی طریقے روبہ عمل لائے جائیں اور اگر اس پر بھی وہ جماعت ابتدائی حقوقِ انسانیت کے حصول میں ناکام رہے تو اس کو ارضِ ظالم علاقہ سے نکل کر کہیں اور پناہ ڈھونڈنی چاہیئے۔ ایک منظم حکومت کے خلاف بغاوت خانہ جنگی کا موجب ہوگی اور اصلاح کی کوشش اس تباہی سے زیادہ بدتر ثابت ہوگی۔ ظالم حکومت کی قلمرو سے نکلنے کے بعد انہیں اپنے آپ کو طاقتور اور منظم بنانا چاہیئے اور ان ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے حق پسند حکومتوں سے اعانت طلب کرنی چاہیئے۔ مملکت میں

رعایا کی حیثیت سے رہنے کی صورت میں اسلام صرف آئینی طریقہ اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ سیاسی اقلیتوں کی طرف سے مسلح بغاوت سلطنت کے سب سے نظم و ضبط کو درہم برہم کر دیتی ہے، اور ایسے اشخاص کے ظالمانہ اور مجرمانہ میلانات کو بے لگام چھوڑ دیتی ہے جو اس ابتری سے ذاتی نفع حاصل کرتے اور تہذیب، بے امنی اور غارتگری کے موجب ہوتے ہیں۔ ظالم علاقوں سے ہجرت اور نسبتاً پرامن علاقوں میں توطن کی مثال خود آنحضرتؐ نے قائم فرمائی ہے جو مسلمانوں کے لئے ہر زمانہ میں اسوۂ حیات بن گیا ہے۔ لیکن جب مسلمان ایک طاقت و سلطنت کی صورت میں خود کو منظم کر لیں تو مظلوم کی حمایت ان کا فرض ہو جاتا ہے، خواہ وہ کوئی ہو اور کہیں بھی ہو۔ نیکی کی حفاظت اور برائی کا فرد کرنا، جو ظلم و تعدی کی صورت میں مملکت کے اندر یا باہر رونما ہوتی ہے، ہر مسلمان فرد اور ہر مسلمان مملکت پر فرض کیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بین الاقوامی اخلاق کے محتسبوں کی طرح تمام دنیا میں گشت لگاتے پھریں اور جنگ آزمائی کے لئے اپنے متعینہ جتھے ہر اس سلطنت کے خلاف لے جائیں جو اسلامی ضابطہ اخلاق کے مطابق زندگی بسر نہ کر رہی ہو۔ اسلامی مملکت کو یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ محض من مانے دیگر اقوام کی زندگی اور ان کے طور طریقوں کے قوانین میں دخل اندازی کرے، جب تک کہ وہ قوم کھلے طور پر حقوق کو پامال کرنے والی ثابت نہ ہو۔ ایک مسلمان سلطنت کو بطور خود یا دیگر حریت پسند مملکتوں کے ساتھ مل کر ظلم و زیادتی کا قلع قمع کرنے اور عام باشندوں کے حقوق کو دوبارہ بحال کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اسلام مذہبی آزادی یا آزادیٔ ضمیر کو ایک مہذب مملکت کا جزو لازمی قرار دیتا ہے، خواہ وہ مملکت اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔

۲۲- اسلام نے غیر مسلم مملکتوں میں مسلمانوں کے بحیثیت رعایا رہنے کے امکان کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ ایک ایسی ملت کے لئے جو تمام دنیا پر چھا جانا چاہتی ہو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہر جگہ اپنی ہی حکومت کے تحت رہے گی۔ جب مسلمان اذیت و عقوبت کے باعث حبشہ کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے، جو ایک عیسائی ریاست تھی تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ وہاں شریف و پابند قانون شہریوں کی طرح رہیں اور بحیثیت پابند قانون شہریوں کے انہوں نے نجاشی کے دربار میں عزت و وقار حاصل کیا۔ ایک مسلمان جو غیر مسلم مملکت میں بحیثیت شہری کے رہتا ہے وہ اس حکومت کے قانون کی پابندی کا خاموش معاہدہ کرتا ہے مگر جہاں تک اس کی شخصی زندگی کا تعلق ہے وہ اپنے اسلامی تقاضوں کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتا۔ اسلام معاہدوں اور عہدناموں کے ایفا پر بڑا زور دیتا ہے خواہ وہ بعض پہلو سے مسلمانوں کے لئے کتنے ناخوشگوار ہی ہوں۔ ایسے عہد نامے کئے گئے اور جن کی پابندی صوری و معنوی حیثیت سے کی گئی، ان کی متعدد مثالیں خود آنحضرتؐ نے پیش فرمائی ہیں۔ "سچا مسلمان وہ ہیں جو اپنے معاہدات کی پابندی کرتے ہیں" "اپنے عہدوں کو پورا کرو" یہ ایک ایسا حکم ہے جس کا بار بار اعادہ ہوا ہے۔ جب تک دوسری جانب سے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، اور کھلے یا پوشیدہ طور پر تمہارے خلاف جارحانہ عمل کی تیاری اور سازش نہیں کی جاتی، تم کو اپنے عہد کا پورا کرنا لازم ہے، خواہ وہ کسی نیم وحشی مشرک